یہاں پر ایک اہم سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تفسیر اور علوم تفسیر پر اس قدر ذخیرہ موجود ہے تو پھر نئی تفسیر کی کیا ضرورت ہے اور اس کا کیا اصول ہونا چاہیے۔

اس سوال کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔

(۱) یہ تفسیریں مواد، تنظیم و تنسیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنی آخری منزل کو پہنچ گئی ہیں جس کے بعد اس میں تحسین و تکمیل کی گنجائش نہ ہو۔

(۲) قدماء مفسرین نے اپنے زمانے کے لحاظ سے یہ کتابیں لکھی تھیں۔ مگر اب جبکہ علم کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے اور کم وقت میں زیادہ چیز جاننے کی ضرورت ہے لہٰذا ان تفسیروں میں جو بہت سی دور از کار چیزیں آگئی ہیں، جن کی چنداں ضرورت نہیں تھی مگر اُس زمانہ کے لحاظ سے مفید تھیں، ان سے نئی تفسیر کو خالی ہونا چاہیے۔

(۳) ان تفسیروں کی زبان بھی بہت خشک اور نامانوس ہے۔ نیز ان میں اس قدر تکرار اور ایک دوسرے مواد کی ترتیب و تبویب اس قدر خلط ملط اور نقص ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ بہت زیادہ ہیں بہت کم ہیں۔

(۴) موجودہ عمدہ تفسیریں جن کا ابھی ذکر ہوا وہ نامکمل ہیں اور صرف چند سورتوں کی تفسیر ہیں۔

(۵) سابقہ تفسیر قدیم و جدید انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں اس وقت عالم اسلام و عرب کی مشترکہ کوشش سے تدریجی طور پر مجموعی لحاظ سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور تفسیر قرآن اور علوم قرآن کے سلسلہ میں مختلف مباحث پر مختلف کمیٹیاں قائم ہوں جن میں عالم اسلام و عرب کے دو ممتاز علماء شریک ہوں جن کا قرآنیات سے گہرا تعلق ہو اور ہر کمیٹی کے نتیجہ کو دوسری کمیٹی تنقیدی نقطۂ نظر

سے دیکھے اور مباحثہ کرے۔

اس مشترک سعی کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ قرآن میں جس قدر بے پایاں علم ہیں اور جس ذات کی طرف سے اترا ہے ایک انسان اس کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نئی تفسیر کا کیا طریقہ اور کیا منہج ہونا چاہیئے۔ اس کے لیے اسکیم اور کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے میرے خیال میں تدریجی طریقہ کا اپنانا مفید ہوگا۔

سب سے پہلے جو تفسیر لکھی جائے، اس میں اس فکر کی کلی تطبیق ہو جس کو مفسرین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے مگر عمدہ کام بہت کم ہوا اور وہ یہ ہے کہ قرآن کو شروع سے آخیر تک فکری لحاظ سے منظم و مربوط کتاب مانا جائے۔ جس کے علمبردار اس زمانہ میں ہندوستان کے علامہ فراہی ہیں۔ اس فکر کے موئدین کی یہ دلیل بہت معقول معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آیتوں کو مختلف سورتوں میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک ہی باب و سورت میں تمام آیتوں کو جمع کر دیا جاتا

مگر افسوس ہے کہ اس نہج پر کوئی بھی مکمل تفسیر نہیں ہے اور جو ہیں ان میں باقاعدہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے اور جو فکری و معنوی ربط و تعلق بنائے گئے ہیں وہ لبا اوقات کمزور اور عقلی لحاظ سے نا قابلِ قبول ہیں۔

اس سلسلہ میں نظم الدرر فی تناسب الآی والسور اور تفسیر کشاف، رازی، عبدہٗ، رشید رضا، سید قطب اور ہندوستان میں مولانا فراہیؒ، مولانا تھانویؒ، مولانا آزاد کے یہاں بہت کچھ مواد مل جاتا ہے۔

مولانا فراہی ان تمام مفسروں میں تنہا مفسر ہیں جنہوں نے قرآن میں نظم معنوی کو معلوم کرنے کے لیے مستقل کتاب دلائل النظام لکھی اور اس میں قرآنی نظم کو

معلوم کرنے کے لیے بہت سے نقلی وعقلی طریقے بتائے۔

مولانا فراہی نے قرآن فہمی میں چالیس سال گزارے مگر وہ پوری تفسیر نہ لکھ سکے۔ کیونکہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا اس پر ان کو قدم قدم پر دشواری سامنے آئی۔

اس طریقہ پر تفسیر کرنے سے فراہی صاحب کے قول کے مطابق مختلف ومتضاد تاویلات میں سے صحیح تاویل کھل کر سامنے آجاتی ہے اس قسم کی جو تفسیر کی جائے تو ہر سورت کی ابتدا میں اس کے موضوع یا موضوع کے جزئی وکلی عناصر کو خلاصہ کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ ہر سورت مکمل خیال و موضوع کا ایک پیکر معلوم ہو۔

۲۔ دوسری تفسیر موضوعی لحاظ سے ہو جس طرح کی مصر کی ذاکر بنت الشاطی نے کی ہے۔

۳۔ جب یہ دونوں تفسیریں مکمل ہو جائیں، اس کے بعد ان کے اندر جو مشترک چیزیں ہیں ان کی روشنی میں ایک تیسری تفسیر لکھی جائے اور جہاں کہیں اختلاف ہو اس کو ازسرنو غور کیا جائے۔ اس طرح ایک بہترین تفسیر وجود میں آسکتی ہے جو تمام تفاسیر سے اصح اور معتبر ہوگی۔

اس قسم کی تفسیر کی تیاری کے ساتھ علوم قرآن کے مختلف اہم پہلوؤں پر نہایت محققانہ مستقل بحثیں ہونی چاہئیں اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ نظم قرآن کو کیسے جانا جائے۔ قرآن اس کو کس طرح پر بیان کرتا ہے اور کس طرح قرآن اپنے اساسی اغراض ومقاصد کو جیسے توحید، رسالت اور آخرت مستقل موضوع بناتا ہے اور پھر دوسرے جزئی امور کی طرف ملتفت ہوتا ہے۔

۲۔ بلاغت قرآنی کو معلوم کرنے سے پہلے خود قرآن کے اسالیب کو معلوم کیا جائے جو قرآن نے خود استعمال کیے ہیں۔

۳۔ اقسام القرآن پر مفصل کتاب ہو جس میں تمام قسمیہ آیات کے وجہ استدلال اور مقسم بہ اور مقسم علیہ کو ظاہر کیا جائے، ساتھ ہی ان میں جو بلاغتی خوبیاں ہیں ان کو بھی اجاگر کیا جائے۔

۴۔ ناسخ و منسوخ پر مستقل رسالہ ہو جس میں اس قسم کی تمام آیات کو یکجا کیا جائے اور آیا واقعی ان میں نسخ ہے یا نہیں اس کو بیان کیا جائے۔ اور امام سیوطی اور شاہ ولی اللہ نے ناسخ و منسوخ میں تاویل کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے، ساتھ ہی ان آیات کے بعد تخصیص و تعمیم کی جو آیات ہیں ان کے اتارے جانے کی حکمت کو بیان کیا جائے۔

۵۔ اسباب نزول پر مستقل بحث ہو اور ان تمام آیات کو جن کی تاویل میں مشکل پیش آتی ہے یکجا جمع کر کے ان کی تاویل بیان کی جائے اور ان واقعات کو ظاہری سبب بنا کر جو آیات نازل ہوں ان کے اندر جو فلسفہ ہے اسکو اجاگر کیا جائے۔

۶۔ قصص القرآن پر محققانہ بحث ہو اور قصص کے تاریخی پہلو کے علاوہ ان میں جو حکم و مواعظ اور فلسفہ ہیں ان کو بیان کیا جائے۔

۷۔ امثال و تشبیہات پر مستقل کتاب ہو جس میں ان کے فنی اور معنوی حکمت و فلسفہ کو بیان کیا جائے۔

۸۔ محادلۂ یہود و نصاریٰ، مشرکین و منافقین کے اندر جو فلسفہ موجود ہے اس کو مفصل بیان کیا جائے اور صرف اس کی ظاہری صورت پر اکتفا نہ کیا جائے۔

یہ چند وہ عام موضوعات ہیں جن کی قرآن فہمی میں ہمہ وقت ضرورت پیش آتی ہے اور اس قسم کی اب تک جتنی کتابیں ہیں وہ بے حد سطحی ہیں۔ لہذا ضرورت ہے کہ ان پر از سر نو بہت تحقیق کے ساتھ کام ہو اور کچھ نئی چیزیں دریافت کی جائیں جو اب تک دریافت نہ ہو سکیں۔

اس طرح قرآن وعلوم قرآن پر اس وقت ایک عالمی اور اسلامی سطح پر محنت وکوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس طریقہ کا کوئی قدم اٹھایا گیا تو یقیناً اہم اور مفید کام اب بھی ہو سکتا ہے جو پہلے کاموں سے زیادہ بہتر و زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ امت کے اندر ایک جوش اور ہمت ہو اور اس فکر سے گریز ہو کہ جو کچھ قدیم مفسروں نے لکھا ہے اب مزید اس میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً نہیں ہے۔ مگر ان میں نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے اور جو کج روی ہوتی ہے اس کو دور کیا جا سکتا ہے۔

## بعض اہم مراجع


۱۔ تفسیر طبری
۲۔ تفسیر الکشاف
۳۔ تفسیر ابن کثیر
۴۔ الدر المنثور
۵۔ التفسیر البیانی للقرآن
۶۔ تفسیر نظام القرآن
۔ تاویل الفرقان بالفرقان
۷۔ فی ظلال القرآن
۸۔ دلائل النظام
۹۔ الفوز الکبیر
۱۰۔ المنہل الخالد
۱۱۔ البرہان فی علوم القرآن
۱۲۔ الاتقان فی علوم القرآن
۱۳۔ مذاہب فی التفسیر الاسلامی
۱۴۔ مباحث فی علوم القرآن
۱۵۔ مناہج تجدید فی النحو والبلاغة والتفسیر والادب
۱۶۔ منہج الامام عبدہ فی تفسیر القرآن
۱۷۔ منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن۔
۱۸۔ مقدمۃ ابن خلدون
۱۹۔ فجر الاسلام
۲۰۔ ضحی الاسلام

# شایق اور انکا دیوان فارسی[۱]

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی

انیسویں صدی عیسوی میں جب شمالی ہند میں فارسی کا چرچا کم ہوا اور آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ اردو نے لینی شروع کی، اس وقت جنوب ہند میں کرناٹک کے نوابوں نے بڑی فراخدلی سے فارسی کی سرپرستی کی۔ کرناٹک کے آخری نواب والاجاہ امیر الہند عمدة الامراء مختار الملک سراج الدولہ غلام محمد غوث خاں شہامت جنگ متخلص بہ اعظم (متوفی: ۱۸۵۵/۱۲۷۲) نے اس دور میں ایک مجلس مشاعرہ کی تشکیل کی جس میں مصرع طرح کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور مختلف شعرا جنہیں اس مجلس میں شرکت کی اجازت تھی، اپنی اپنی فارسی غزلیں پیش کرتے۔ شعراء کے کلام پر تبصرہ اور تنقید ہوتی۔ میر مجلس، محمد حسین قادری مخاطب بہ شیریں سخن خان بہادر متخلص بہ راقم[۲] اور حکمین مشاعرہ

---

[۱] دہلی یونیورسٹی لائبریری، شمار مخطوطہ: ۲۸۳۶۸۵

[۲] راقم اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے انہیں نواب اعظم کی ہمدرسی کا فخر حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ اپنے تذکرے گلزار اعظم کی تالیف میں نواب موصوف نے راقم کو شامل رکھا اور راقم نے بھی اس کی ترتیب میں نواب کا ہاتھ بٹایا۔ جب مجلس شاعرہ قائم ہوئی تو راقم کو اس کا میر بنا کر افضل الشعراء شیریں سخن خان بہادر کا خطاب دیا: سخنوران بلند فکر، طبع مدراس، ص: ۱۷۱ -

واقف[1] و قدرت[2] اس بحث و مباحثہ میں اپنی رائے دیتے، اگر مسئلہ حل نہ ہو پاتا تو نواب موصوف اس میں مداخلت کرتے اور ان کی رائے مسلم مانی جاتی تھی[3]۔

غلام محی الدین المخاطب بہ شائق علی خاں متخلص بہ شائق نے کرناٹک میں اسی دور میں زندگی گزاری ہے۔ شائق ۱۲۰۲/۸-۱۷۸۷ میں اُدگیر (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے[4]۔ ان کا خاندان علما اور صوفیوں کا خاندان تھا۔ شاہ صبغۃ اللہ

---

[1] مولوی میران محی الدین قادری متخلص بہ واقف ۱-۱۷۹۰/۱۲۰۵ میں ادگیر میں پیدا ہوئے علمی فضیلت اور شاعرانہ مہارت کی وجہ سے نواب اعظم نے انھیں حکم اول مجلس شاعرہ مقرر کیا۔ مدراس میں شہر استاد کہلاتے تھے۔ نواب اعظم نے مدراس میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسۂ اعظم رکھا۔ واقف اس مدرسہ میں مدرس مقرر کیے گئے۔

[2] محمد قدرت اللہ خاں گوپاموی مؤلف تذکرہ نتائج الافکار کا شمار پختہ گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ قدرت ۱۷۸۵/۱۱۹۹ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۱۲/۱۲۲۷ میں مدراس آئے۔ نواب اعظم جاہ بہادر نواب کرناٹک (۹-۱۸۱۸/۱۲۳۴ — ۶-۱۸۲۵/۱۲۴۱) کے دربار سے خان کا خطاب اور نواب عظیم الدولہ بہادر رحمت مآب (۲-۱۸۰۱/۱۲۱۶ - ۹-۱۸۱۸/۱۲۳۴) کے مقبرے کی تولیت مرحمت ہوئی۔ سخنوران بلند فکر ص ۱۲۶ ؛ نتائج الافکار، طبع بمبئی : ص ۳۔

[3] اشارات بینش : (مخطوطہ) ایشیاٹک سوسائٹی شمارہ ۶۲۰، ورق ۳، ۹

[4] گلزار اعظم : ص ۲۳۳

[5] اشارات بینش : ورق ۳۲ ب ؛ نتائج الافکار : ص ۲۰۶ ؛ اسکے علاوہ دیوان میں موجود ان اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شائق کا وطن اُدگیر تھا۔

تا کجا شائق تکاپو بہر حشمت میکنی ؛ رفتی گر یابدت برقلعۂ ادگیر باش (دیوان: ص ۴۲)

خلق ازملکہ بہ مدراس زواقف دیدم ؛ محو گردید ز دل الفت ادگیر مرا (دیوان: ص ۱۱)

نائب رسول کے مرید مولانا حبیب اللہ اور سید محمد گیسو دراز، شایق کے خاندانی بزرگوں میں سے ہیں۔

شایق کے آبا و اجداد گلبرگہ سے ہجرت کرکے اُدگیر میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے[1]۔ عمر کے ابتدائی دور میں شایق اپنے والد شاہ احمد ابو تراب کے ہمراہ مدراس چلے آئے اور مدراس ہی میں مختلف اساتذہ کی نگرانی میں انکی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی[2]۔ مولوی عبدالقادر اور مولوی شرف الملک بہادر نے انہیں عربی کی تعلیم دی۔ مولانا محمد باقر آگاہ[3] اور مولوی سید خیرالدین فایق نے انھیں فارسی سے روشناس کرایا۔ مؤخرالذکر ہی نے فارسی شاعری میں بھی شایق کی راہنمائی کی[4]۔ شایق اردو کے شاعر بھی تھے اور اس میدان میں مرزا محمد ظہیرالدین علی بخت اظفری[5] اور میر شاہ حقیقت حسین نے ان کی تربیت کی[6]۔

---

[1] گلزار اعظم: ص ۲۳۳۔ [2] ایضاً: ص ۲۳۳، نتایج الافکار: ص ۷۰۴

[3] ان کے والد محمد مرتضیٰ المعروف بہ محمد صاحب تھے۔ ان کے اسلاف کا وطن بیجاپور تھا اور یہ ۱۷۴۵/۱۱۵۸ میں بمقام ویلور پیدا ہوئے، پندرہ سال کی عمر میں فارسی نظم و نثر لکھنے پر قادر ہوگئے۔ آگاہ حضرت سید شاہ ابوالحسن قدس سرہ سے بیعت تھے اور آپ ہی سے اشعار کی اصلاح لیتے تھے۔ آگاہ نے اپنے دور میں بڑا نام پیدا کیا اور ۱۸۰۵/۱۲۲۰ میں انتقال کیا، سخنوران بلند فکر: ص ۱۳۲-۱۳۴۔ [4] گلزار اعظم: ص ۲۳۳، اشارات بنیش: ورق ۳۲ ب [5] ان کے والد کا نام محمد ولی تھا جو اورنگ زیب کی پوتی عفت آرا کے پوتے تھے۔ اظفری ۱۷۹۷-۸/۱۲۱۲ میں مدراس پہنچے اور یہاں مستقل قیام اختیار کیا۔ اظفری اردو کے اچھے شاعر اور ترکی زبان کے ماہر تھے لیکن فارسی شاعری کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۱۸-۹/۱۲۳۴ میں ہوا۔ گلزار اعظم: ص ۴۱۔ [6] گلزار اعظم: ص ۲۳۳۔

شایق کے مربی نواب اعظم نے اپنے تذکرہ گلزار اعظم میں شایق کی شاعرانہ مہارت کی بہت تعریف کی ہے۔ اعظم نے لکھا ہے کہ انھیں فی البدیہہ شعر کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بیان کیا ہے کہ شایق نے نواب موصوف کی فرمائش پر تیرہ دن کے دوران نعت اور منقبت میں سینتیس (۳۷) غزلیں کہی تھیں[۱]۔

شایق ۸-۱۸۱۷/۱۲۳۳ میں اپنی شادی کے سلسلے میں اپنے وطن ادگیر گئے اور وہاں سے واپسی پر نواب محمد غوث اعظم ہی کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور شہرت و نام پایا یہی وہ زمانہ ہے جب نواب نے انھیں شایق علیخاں کا خطاب عطا کیا اور اپنے ایک مدرسہ میں استاد مقرر کر دیا[۲]۔

اپنی خاندانی روایات کے مطابق شایق کو بھی تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ اسی مناسبت سے یہ اپنے چچا سید شاہ منصور قادری کے مرید ہو گئے تھے[۳]۔ شایق کی وفات ۴-۱۸۳۳/۱۲۴۹ میں ہوئی جس پر ان کے چھوٹے بھائی اور مجلسِ مشاعرہ کے حَکَم مولوی واقف نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا:-

بیدلِ عصر حضرت شایق — قدس اللہ سرہٗ السامی
کام دل جست چوں بقرب اللہ — کہ جہانست جای ناکامی
ہاتفم سال رحلتش فرمود — رفتہ ہیہات ہم درم جامی[۴]

۱۲۴۹

یہ واقف ہی تھے جن کے اچھے برتاؤ اور مہربانیوں کی وجہ سے شایق کے دل سے غریب الوطنی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔

خلق از لسکہ بہ مدراس ز واقف دیدم — محو گردید ز دل الفت ادگیر مرا[۵]

---

۱ گلزار اعظم: ص ۵-۲۳۴ ۲ ایضاً ص ۲۳۵، اشارات بینش: ورق ۳۲ ب ۳ ایضاً ص ۵-۲۳۴، نتائج الافکار: ص ۷-۴ ۴ ایضاً ص ۲۳۵، اشارات بینش ورق ۳۲ ب ۵ دیوان شایق: ص ۱۱-

نواب اعظم نے گلزار اعظم میں شایق کے مندرجہ ذیل فارسی اور اردو آثار کا ذکر کیا ہے:۔ فارسی

۱۔ مرج البحرین: نعت ومنقبت میں غزلوں کا مجموعہ۔

۲۔ روضۂ قدسیہ: شایق کے آبا واجداد کے حالات۔

۳۔ مختصر فارسی دیوان۔

اُردو:—

۱۔ رشک نسب۔

۲۔ مختصر دیوان۔

دیوان شایق:۔ شایق کے اس فارسی دیوان کا ذکر کسی فہرست نگار نے نہیں کیا ہے۔ اس فارسی دیوان کے مخطوطہ کے شروع صفحہ پر ذیل کی عبارت درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام چمنستانِ فصاحت ہے۔

"دیوانِ شایق مسمی بہ چمنستانِ فصاحت، من تصنیف شاعر نازک خیال، سرآمد اہل کمال، وحید عصر، علامۂ دہر، جناب غلام محی الدین صاحب المخاطب بہ شایق علی خاں تخلص شایق، مرحوم مغفور حسب اجازت، خاکسار سید خواجہ معین الدین چشتی معروف بخواجہ بڑا، تخلص سلام، مدراسی نبیسہ حضرت شایق۔"

اس سلسلہ میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ اس دیوان کا ذکر شایق کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے کیوں نہیں کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اعظم نے جس "مختصر فارسی دیوان" کا نام لیا ہے، زیر بحث دیوان وہی ہو۔ بہر حال اس دیوان پر کوئی تاریخ موجود نہیں اس کا سائز ۶" × ۸" ہے اور یہ ننیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ حاشیوں پر کہیں کہیں مشکل الفاظ کی تشریح

کی گئی ہے۔ معمولی مگر صاف نستعلیق میں لکھے گئے اس دیوان میں کل (۹۳) تیرانوے غزلیں، ایک مستزاد، دو قطعے، چھبیس ۲۶ رباعیاں، کچھ متفرق اشعار اور منقبت میں دو ۲ مطلع جمع کیے گئے ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل جو حمد باری تعالیٰ میں ہے، اس مطلع سے شروع ہوتی ہے:

الٰہی زنگ روی گل رخان دہ داستانم را
بہ رنگِ کاکل مشکیں مسلسل کن بیانم را[1]

شایق کا یہ دیوان مختصر سہی لیکن ان کی شاعرانہ مہارت، صوفیانہ طرزِ فکر اور فنی پختگی کا آئینہ دار ہے۔ دیوان کی بیشتر غزلیں شاعر کی بلند فکری کا نمونہ ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی کہ شایق غزل کی نزاکت کو سمجھتے تھے اور اس صنف میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اگر کچھ اشعار سے شائق کے صوفیانہ مزاج کا علم ہوتا ہے اور محبوبِ حقیقی کی تعریف میں شعر ملتے ہیں تو ایسے اشعار بھی کثرت سے نظر آتے ہیں جس میں محبوب مجازی کی تحسین و توصیف کی گئی ہے۔ اور جو اپنے شیریں انداز بیان، آسان طرز اور عام فہم ہونے کے وجہ سے پڑھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ اپنی اس خوبی کو شایق نے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

گہی گریان وگہ خندان، گہی سرمست وگہ حیران
گہی صوفی وگہ رندم، اغثنی یا رسول اللہ[1]

مزید برآں شایق خود کو عاشقوں کا امام بتاتے ہیں کیوں کہ انہیں محبوب حقیقی کے عاشق ہونے کا شرف حاصل ہے ؎

تا فدای الفتِ معشوقِ رحمانی شدم　　در دو عالم گشتہ ام شایق امام عاشقاں[2]

[1] دیوان شایق: ص
[2] دیوان شایق: ص ۶۳

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ شایق تصوف سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اسی وجہ سے دیوان میں ایسے متعدد شعر نظر آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور صاحب تصوف ان کے نزدیک نہ صرف محترم تھے بلکہ شایق ان سے تعلق کو اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ ایک پوری غزل سید محمد غوث گوالیاری (متوفی: ۱۵۶۲-۰۳/۹۷۰) کی شان میں ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:-

خوش نایدش ہوای بہشت بریں گہی — یکدم چو سیر کرد کسی گلستان غوث

ازظلمت گناه، چہ باک است شایقا — داغیست بر جبین من از آستان غوث[1]

شاہ جیلان کی تعریف میں بھی بہت سے شعر دیوان میں موجود ہیں، مثلاً:

تعالی اللہ چہ شان شاہ جیلانست درعالم — کہ گردوں پیش درگاہش بسر خود بر زمین دارد[2]

در بزم گاہ وحدت مسند نشین عزت — کس نی چو شاہ جیلان من خوب میشناسم[3]

وحدت الشہود کی تائید میں شائق نے ذیل کے اشعار میں اظہار خیال کیا ہے:-

ہماں یک ذات شد در کثرت کون و مکاں مشہود
تو شاہد باش ای زاہد زعرفانی کہ من دارم[4]

ہرچند بی نشانی ای جان خلق لاکن
ظاہر توئی و پنہاں، من خوب می شناسم[5]

تراچگونہ دگر دانم از نشان یارب — وجود خویش عیاں کردہ لنشانی چند[6]

صوفی منش ہونے کی وجہ سے شایق نے ایک حد تک دنیوی جھمیلوں سے بچ کر زندگی گزاری ہے۔ اور اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر ہی وہ دعوی کرتے ہیں کہ دنیا میں شہرت و نام پانا آسان ہے۔ مگر دنیا کو ترک کر دینا اور گوشہ نشینی

---

[1] دیوان شایق: ص ۲۳۔ [2] ایضاً: ص ۳۳۔ [3] ایضاً: ص ۵۶
[4] ایضاً: ص ۶۴۔ [5] ایضاً ص ۵۵ [6] ایضاً: ص ۳۰

کی زندگی گزارنا دشوار ہے۔

سہل باشد شہرۂ آفاق کردن خویش را!
ہمچو شایق در جہانِ عزلت گزیدن مشکل است[1]

شایق ساری پریشانیوں کی وجہ نفس پرستی کو سمجھتے ہیں اور مال وزر کے پیچھے دوڑنا ان کے نزدیک تکلیفوں اور نامرادیوں کو دعوت دینا ہے۔

کثرت زر نقد آفت در بغل دارد نہاں — اجتماع زر کند آخر پریشاں غنچہ را[2]
از خویش برآ و بی نشان شو — آماج بلا است این نشانہا[3]

دنیا میں دکھ سکھ کا ساتھ چولی دامن کا ہے وقت سدا ایک سا نہیں رہتا، اگر کوئی آج پریشانی سے دوچار ہے تو وہ وقت دور نہیں جب اس کی ہمت اور محنت اسے راحت واطمینان سے ہمکنار کر دے گی۔ شایق نے اس کلیہ کو نہایت آسان اور دلنشین انداز میں نظم کیا ہے۔

عیشی بجہان غیر الم نیست میسر — این گلشن رعنا گل بیخار ندارد[4]

اخلاقی قدروں کی اہمیت پر فارسی کے تقریباً ہر شاعر نے اظہار خیال کیا ہے شایق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن ہمارے شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ آسان، دلنشین اور مدلل طریقے سے اپنے پڑھنے والوں میں ان خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ سخاوت کے سلسلے میں شایق نے کہا ہے۔

سخاوت پیشۂ خود کن توانگر تا شوی شایق — کہ چون گل کیسہ بکشاید بطرحش زر شود پیدا[5]

لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا شایق کی نظر میں بے جا ہے۔

دستِ خواہش پیش زرداران دوراں مکن — ہرچہ خواہی چوں صدف از عالم اعلیٰ طلب[6]
خم مشو پیش بزرگان بہر سیم وزر کہ طفل — شاخ را سازد برای میوہ ہای خام خم[7]

---

[1] کلیات شایق، ص ۱۰۸ [2] ایضاً ص ۶ [3] ایضاً ص ۳ [4] ایضاً ص ۳۵ [5] ایضاً ص ۱۲-۱۳ [6] ایضاً ص ۱۴ [7] ایضاً ص ۵۳۔

اگر اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور سے مقابلہ کیا جائے تو شایق کا زمانہ فارسی علم و ادب کے لحاظ سے تنزل کا دور ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی نے بادشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اپنے پیشرو بادشاہوں کی طرح عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کر سکیں اور ان کی قابلیت اور فضیلت کے شایانِ شان ان کی قدر و منزلت کریں اور مال و دولت سے نوازیں شایق نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اپنے دور کی تعلیمی بدحالی کی طرف اشارہ کیا ہے :-

من ازیں روزگار می ترسم خارِ جہل است نوک زن ہر سو[1]
برنگ غنچہ بباید بست لب را از سخن گوئی دریں گلشن کہ خارستانِ ناہمیست نشتر زن[2]

ہر انسان اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی تحریروں میں ایسے اشارے ضرور کرتا ہے جس سے اس کے زمانے کے سماجی یا سیاسی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا اور یہ لوگ اب ہر جگہ اور ہر معاملہ میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے۔ شایق نے اس تبدیلی کو بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے :-

چو اکثر با فرنگی ہست اکنوں کار و بار اینجا چرا مشتاق چشمانش نگردد جانِ من شایق[3]

شایق نے اپنے استاد فایق کی تعریف کی ہے ان کی شخصیت کو اپنے زمانے میں غنیمت سمجھا ہے اور ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

فیضش ہمیشہ باد، بدوراں غنیمت است عالی سخن چو حضرتِ فایق ندیدہ شد[4]
حضرتِ فایق چو استاد است چوں نتازم بہ شعر خود شایق[5]

شایق کی بیشتر غزلیں رواں، سہل اور شستہ ہیں، انداز بیاں میں زور ہے۔ عام فہم

---

[1] دیوان شایق ص ۶۵ [2] ایضاً ص ۸۶ [3] ایضاً ص ۹ [4] ایضاً ص ۱۹ [5] ایضاً ص ۱۷